SHNAKHAT E(ISSN) 2709-7641, P(ISSN) 2709-7633
Vol:3, ISSUE:3 (2024) PAGE NO: 467-488
Publishers: Nobel Institute for New Generation
http://shnakhat.com/index.php/shnakhat/index

Cite us here: Dr. Khalid Mahmood & Jawad Maqbool. (2024). An Exploratory Study of Beloved's Love Letters Mentioned in the Urdu Songs: مطالعہ تحقیقی ایک :محبوب کے خطوط کا تذکرہ میں اردو گیتوں. *Shnakhat*, 3(3). Retrieved from https://shnakhat.com/index.php/shnakhat/article/view/352

An Exploratory Study of Beloved's Love Letters Mentioned in the Urdu Songs

اردو گیتوں میں محبوب کے خطوط کا تذکرہ :ایک تحقیقی مطالعہ

Dr. Khalid Mahmood[1] **Jawad Maqbool**[2]

[1]Lecturer, Department of Pakistan Studies, Allama Iqbal Open University. Islamabad.
khalid.mahmood@aiou.edu.pk
[2]Deputy Treasurer, Treasurer Office, Allama Iqbal Open University. Islamabad
jawad.maqbool@aiou.edu.pk

Abstract

The process of writing letters is thousands of years old, not centuries. In ancient times, letters were sent to distant places through birds. Among these birds, the name of the pigeon is noteworthy. For this purpose, these pigeons were well nourished as well as intensively trained. Similarly, the practice of conveying the feelings of human beings and situations by writing a letter to their beloved is very old. Poets in their poetry have described the process of writing a letter to beloved one and then this poetry has been transformed into songs by many singers through the stages of song. In this research, the Urdu songs sung in Pakistan and India have been described, in which the poets have expressed their feelings of love through writing the letters to their beloved.

Keywords: Beloved, Songs, Love letters, Post, Traditions, Tickets.

خط لکھنے کا سلسلہ کتنا قدیم ہے اور سب سے پہلا خط کس نے کس کو لکھا تھا؟ اس حوالے سے کوئی مستند رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے تاہم اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ یہ سلسلہ صدیوں نہیں بلکہ ہزاروں سال پرانا ہے۔ خط جذبات کے اظہار کا ایک اہم ذریعہ ہے جس کی بدولت ہم اپنے خیالات یا پیغام کسی کاغذ پر لکھ کر دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں یہ پیغام کاغذ کے علاوہ کپڑے، چمڑے، درخت کے پتوں، لکڑی یا اس جیسی کسی دوسری چیز پر لکھ کر محفوظ کیا جاتا تھا۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں: " خط دلی خیالات وجذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے۔"(1)

خط لکھنے کے عمل کو مکتوب نگاری بھی کہا جاتا ہے، یہ ادب کی قدیم صنف ہے اور دنیا کی تقریباً ہر زبان میں رائج ہے۔۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا کہنا ہے کہ: "خطوط نگاری خود ادب نہیں مگر جب اس کو خاص ماحول خاص مزاج، خاص استعداد ایک خاص گھڑی اور خاص ساعت میسر آجائے تو یہ ادب بن سکتی ہے۔"(2)

دیگر زبانوں کی طرح اردو ادب میں بھی خطوط لکھنے کا عمل بہت وسیع اور پرانا ہے۔ یہ عمل ایک باقائدہ صنف کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس حوالے سے مرزا غالب کے خطوط بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد کو بھی مکتوب نگاری میں ایک مخصوص اہمیت حاصل ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے کے خطوط کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں، ان مجموعوں میں غبار خاطر، برکات آزاد، مکاتیب ابوالکلام آزاد، نقش آزاد اور کاروانِ خیال قابل ذکر ہیں۔ تاہم ان میں سب سے زیادہ شہرت کا حامل مجموعہ غبار خاطر تھا۔

اردو میں مکتوب نگاری کی روایت بیان کرتے ہوئے شکیل احمد لکھتے ہیں کہ "یونانی تہذیب کے فوراً بعد رومن تہذیب کے عظیم شاعر سیسرو (Sisroo) کے مکاتیب لاطینی زبان میں ملتے ہیں۔ اسی دور کے ہیورلس Hurales کے تعلق سے تحقیقات ہوئی ہیں کہ اس نے سب سے پہلا منظوم خط لکھا"۔ آگے چل کر مصنف لکھتے ہیں کہ "جہاں تک اردو میں خطوط / مکتوب نگاری کا تعلق ہے تو فورٹ ولیم کالج کے قیام سے بھی بہت پہلے سے اس کا آغاز ہو چکا تھا۔ عام طور پر رجب علی بیگ سرور اور غلام غوث بے خبر کو اردو کا پہلا مکتوب نگار کہا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر عبدالطیف اعظمی نے امتیاز علی عرشی کے حوالے سے اپنے مقالہ اردو مکتوب نگاری میں بعد از تحقیق یہ بات ثابت کی ہے کہ کرناٹک میں ارکاٹ کے نواب والا جاہ کے چھوٹے بیٹے، حسام الملک بہادر نے اپنی بڑی بھابی نواب بیگم کے نام 6 دسمبر 1822 کو خط لکھا تھا۔ امتیاز علی عرشی کی تحقیق کے مطابق یہ اردو کا پہلا خط ہے"۔3 (

اردو ادب میں خطوط نویسی کے ارتقائی مراحل بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر دوست محمد کہتے ہیں کہ اردو زبان میں خطوط نویسی کا فن ارتقائی مراحل میں عربی اور فارسی زبانوں اور تاریخ سے ہو کر آیا۔ جیسے جیسے

تہذیب انسانی نے ترقی کی ویسے ویسے خطوط نگاری بھی پروان چڑھی۔ تاریخی حقائق کو اگر دیکھا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ "خطوط نویسی کا تعلق عراق کے مشہور شہر بغداد کے ساتھ رہا ہے" کیونکہ بغداد کے ہی ایک علاقے ٹیل اسمارنہ سے ماہرین آثار قدیمہ کو پختہ مٹی کی تختیاں ملی تھیں۔ ماہرین کی تحقیق کے مطابق یہ تختیاں فراعنہ مصر کے نام خطوط تھیں۔ ان خطوط کا زمانہ تحریر لگ بھگ تین ہزار سال قبل از مسیح کا ہے۔ ڈاکٹر دوست محمد نے قرآن مجید کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ "قرآن مجید میں بھی ایک خط کا ذکر ملتا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے یمن کی ملکہ سباء کے نام لکھا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حواریوں سینٹ پال، سینٹ پیٹرس اور بعض دیگر خطوط بھی یونانی زبان میں تاریخ میں ذکر ہیں۔ اسلام کی آمد سے قبل عربوں میں بھی خطوط نگاری کا رواج تھا۔ اسلام کے بعد باضابطہ خطوط لکھے جانے کا آغاز ہوا۔ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی خطوط لکھوائے جو آج بھی محفوظ ہیں۔ حضرت عمر فاروق کے دور میں گورنروں کو ہدایات واحکامات اور اطلاعات وغیرہ کے لیے مکاتیب وخطوط لکھے جاتے تھے۔ حضرت علی کے مجموعہ خطبات میں آپ کے مکتوبات بھی شامل ہیں"۔)4(

جہاں تک اردو زبان میں خطوط نگاری کے ارتقاء کا تعلق ہے تو یہ ارتقاء عربی اور فارسی خطوط نویسی ہی کے زیر اثر شروع ہوا تھا۔ عام طور پر غلام غوث بے خبر اور رجب علی بیگ سرور کو اردو کے ابتدائی مکتوب نگار کے طور پر جانا جاتا ہے لیکن خطوط نویسی کا سب سے پہلا لکھاری کہیں گردش ایام میں گم ہے۔ ایک زمانہ تھا جب خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا تھا۔ دور قدیم میں دور دراز دیہاتوں میں خطوط کی ترسیل ایک یادگار ماضی بن چکا ہے۔ آج سے کوئی چالیس برس پہلے اسی اور نوے کی دہائی میں ایسا وقت تھا جب پاکستان کے زیادہ تر علاقوں میں جی ٹی ایس کی بسیں جایا کرتی تھیں اور محکمہ ڈاک کی جانب سے ڈاک کے تھیلے گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس کے ذریعے مختلف شہروں کو بھجوائے جاتے تھے۔ ڈاکٹر دوست محمد نے اس ضمن میں اپنی یادداشتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ " ہمارے سکول کے ایک ٹیچر جو ایک دلچسپ شخصیت کے مالک تھے، اضافی ڈیوٹی کے طور پر پورے گاؤں اور اس کے مضافات کی ڈاک کی وصولی اور ترسیل کا کام کرتے تھے۔ ہم لوگ جی ٹی ایس کی آمد کے وقت سے پہلے ہی استاد کے ڈاک خانہ میں حاضر ہو کر پاک افواج اور دیگر محکموں میں ملازمت پیشہ رشتہ داروں کے خطوط کے انتظار میں ڈیرہ جما لیتے تھے' اور جب اپنے رشتہ داروں کا خط وصول کر لیتے تو اسے بہت محبت انگیز نگاہوں سے دیکھتے کیونکہ رشتہ داروں کے خطوط سے ان کے حال و احوال سے آگاہی کے علاوہ لفافے کی مہک بھیجنے والے کی خوشبو بھی لئے ہوتی تھی۔ اس زمانے میں جب کوئی نیا نیا بھرتی ہو کر سفر پر نکلتا یا چھٹی گزار کر واپسی کرتا تو گھر والے پتہ نہیں کتنی بار یہ جملہ دہراتے کہ منزل پر پہنچ کر خیریت سے آگاہی کے لئے خط لکھانا بھولئے گا۔

خطوط نویسی کے ساتھ میری دلچسپی کے کئی ایک اسباب تھے۔ پہلی بات یہ کہ خط کے ذریعے ہمارے رشتہ دار ہمیں یہ اطلاع فراہم کرتے کہ سو روپے کا منی آرڈر بھیج دیا ہے، وصولی پر آگاہ کریں۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں اپنے گائوں کے ان چنیدہ لوگوں میں شامل ہوں جنہوں نے اردو زبان میں خط نویسی کا فن بہت جلد اساتذہ کرام کی کرم نوازی کے طفیل سیکھ لیا تھا۔ اس فن کو میں نے 1971ء میں بھارت میں قید اپنے گائوں کے فوجی جوانوں کو ان کی مائوں اور بیویوں کی طرف سے خطوط لکھنے میں ایک قومی فریضہ سمجھ کر خوب استعمال کیا۔ میں جب ان پڑھ مائوں بہنوں اور رشتہ داروں کی سادہ الفاظ میں بتائی ہوئی باتوں کو ادبی انداز میں مکتوب الیہ کو پہنچاتا تو واپسی خطوط میں میرا شکریہ ادا کرنے کے علاوہ تسلیمات و آداب بھی پیش کرتے۔ مجھے آج بھی ایک ماں، جن کا بیٹا (جواب بھی حیات ہے) بھارت میں قید تھا ،یاد ہے جنہوں نے پشتو ٹپہ گا کر مجھ سے کہا کہ یہ بھی لکھ دو "دیدن پہ تورو غرو پناہ دے' وریز خو نہ یم چہ پہ غرو درڑ انگہ شمہ" یعنی ملاقات میں سیاہ اونچے پہاڑ حائل ہیں، میں کوئی بادل تو نہیں کہ پہاڑوں پر پھیل کر آپ کی زیارت کرلوں۔ واہ' وہ بھی کیا دن تھے، جب خطوط سے اپنوں کی خوشبو آتی تھی' اور خط واقعی آدھی ملاقات ہوا کرتا تھا۔ خطوط نویسی کے اس دور میں ایک خاص روایت عید کارڈ بھیجنے کی بھی تھی، عید کارڈ کچھ تو والدین اور دوست احباب کے لئے ہوا کرتے تھے لیکن سب سے زیادہ عید کارڈ اور خطوط ہجر و ہجران کے مارے عشاق کی طرف سے شہر حسن کے حسن جفا کشی کو بھیجے جاتے تھے ایسے عید کارڈ تلاش کئے جاتے جس میں عاشق مہجور کے جذبات کی منظر کشی آسان ہوتی' اور اس پر لکھنے کے لئے خاص اشعار کا بڑی ریاضت کے بعد انتخاب ہوتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اب تو موبائل و کمپیوٹر فیس بک نے خطوط نویسی کو گزرے وقتوں کی کہانی اور نئی نسل کے لئے کار عبث بنا کر رکھ دیا ہے کیونکہ اب تو یاروں' نازنیوں اور مہ جبینوں کے لئے لکھے گئے خطوط میل کے ان باکس میں ایسے محفوظ ہوتے ہیں کہ کوئی انہیں کھول نہیں سکتا۔ سوچتا ہوں وہ محبت بھرا زمانہ کتنا خوبصورت تھا کہ کسی خاص ہستی تک عید اور بعض دیگر مواقع پر خط پہنچانا ایک مہم جوئی سے کم نہ ہوتا تھا ۔۔۔۔۔۔۔ لیکن دل کی بات عرض کروں تو فون سیل یا کمپیوٹر کی سیاہ سپاٹ پردے میں وہ بات کہاں جو خط میں ہوتی تھی یار' رشتہ دار اور محبوب کے خط کے چھونے میں جو ان کے لمس کی خوشبو اور قرب کا احساس ہوتا تھا وہ اب ان جدید ترقی کی چیزوں میں کہاں' خط میں بالکل وہی روحانی جذبہ کار فرما تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بینائی کی واپسی کا تھا۔ یہ احساس کہ اس خط کو کسی نے خود تحریر کرکے اپنے ہاتھوں سے چھوا ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ فرط جذبات میں چوما بھی ہو۔ خط و عید کارڈ وغیرہ کے فقدان سے اور اوپر سے مادیت کے سبب رشتے ناتے' کچھ مصنوعی سے ہو گئے ہیں کیونکہ سیل فون کے ذریعے پیغامات کسی جذبے کی ملاوٹ کے بغیر روانہ کر دیئے جاتے ہیں۔ ہمارے زمانے (جوانی) میں کسی کو خط لکھنا یا عید مبارک دینا، چاہتوں' محبتوں اور جذبات میں گندھا ہوا

ایک انمول معجون ہوا کرتا تھا۔ جو اب فقط ایک فارورڈنگ کلک پر مشتمل رہ گیا ہے۔ سیاہ اسکرین کی اجارہ داری نے احساس محبت و مروت کو کچل کر ایک حقیقی قلبی تعلق کو مجازی و مصنوعی تعلق میں تبدیل کر دیا ہے"۔(5)

ڈاک کا عالمی دن ہر سال 9 / اکتوبر کو منایا جاتا ہے، پاکستان میں اس دن کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ برصغیر میں ڈاک کے نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے انور خان لودھی اپنے ایک مضمون میں اس طرح لکھتے ہیں" ڈاک کا محکمہ برصغیر میں قدیم سرکاری محکموں میں سے ایک ہے، یہاں پہلا ڈاک خانہ 1837 میں قائم ہوا لیکن ایک طویل عرصے تک برطانوی ڈاک ٹکٹوں سے کام چلایا جاتا رہا اور بالآخر 1852 میں پہلا ڈاک ٹکٹ سر بارٹلے فریئر نے جاری کیا۔

چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

بزم اکبر آبادی کا یہ مقبول شعر (جسے غلط طور پر غالب سے منسوب کیا جاتا ہے) رومانوی احساس کا حامل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت اور تاریخ کا دیباچہ بھی ہے۔ پیغام رسانی کیلئے خط لکھنا بنی نوع انسان کی قدیم ترین تاریخ سے بھی ثابت ہے اور آج کے ٹیکنالوجی سے بھرپور دور میں جب سیکڑوں ایپس کے ذریعے پیغام پلک جھپکتے دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں بھیجا جا رہا ہے خط کی روایت دم توڑتی نظر آ رہی ہے۔ بس اتنا ضرور ہے کہ اس کی دستاویزی حیثیت بدستور قائم ہے۔ آج بھی سربراہان حکومت ایک دوسرے کو خط لکھ کر بین الاقوامی تعلقات کے اہم معاملات کو آگے بڑھاتے نظر آتے ہیں۔ پاکستان سمیت دنیا بھر میں آج ڈاک کا دن منایا جا رہا ہے جس کا مقصد ڈاک کے نظام کو بہتر بنانا، محکمہ ڈاک کی اہمیت اور اس کی کارکردگی کو اُجاگر کرنا ہے۔ دنیا میں پہلا ڈاک کا عالمی دن 9 / اکتوبر 1980 کو منایا گیا۔ ہر سال دنیا کے 160 سے زائد ممالک یہ عالمی دن مناتے ہیں اور ہر وہ ملک جو اقوام متحدہ کی خصوصی تنظیم یونی ورسل پوسٹل یونین (UPU) کے ممبرز میں شامل ہے اس موقع پر خصوصی ڈاک ٹکٹ کا اجراء کرتا ہے۔ اس خصوصی ادارے کا قیام 9 / اکتوبر 1847 کو عمل میں آیا۔ اس دن کے منائے جانے کا مقصد ممالک کے درمیان ڈاک کے ترسیلی نظام کے بارے میں قانون سازی کرنا، نئے دور کی جدت کے باوجود ڈاک کی اہمیت اور افادیت کو اجاگر کرنا اور نظام ڈاک کی ترقی کے لیے کاوشیں کرنا شامل ہے۔

موبائل اور لیپ ٹاپ استعمال کرتے ہوئے ہوش سنبھالنے والی نسل کیا جانے کہ کسی زمانے میں گلی میں جونہی ڈاکیا نمودار ہوتا تھا تو سبھی خوش ہو جاتے تھے۔ ڈاکیا گلے میں ایک تھیلا لٹکائے گلی گلی خطوط پہنچاتا نظر آتا تھا۔ ڈاکیا ڈاک لاتا تھا، خیر خبر پہنچاتا تھا، نوکری اور مزدوری پہ پردیس جانے والوں کے گھروں میں پیسے منی آرڈر سے پہنچاتا تھا۔ سائیکل پر سوار خاکی وردی میں ڈاکیے کی گھنٹی بجتے ہی کوئی منی آرڈر لینے تو کوئی خط، پارسل، یا عید کارڈ لینے باہر آجاتا تھا۔ جو لوگ پڑھے لکھے ہوتے تھے جلدی لفافے کھول کر پڑھنا شروع کر دیتے تھے

اور جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے وہ ڈاکیے کی منت سماجت کر کے اس سے ہی خط سن لیا کرتے تھے۔ انٹرنیٹ، ای میل، ایس ایم ایس اور واٹس ایپ وغیرہ کی آمد سے قبل ڈاکیا ہی یہ تمام فرائض انجام دیتا تھا اور ہر کسی کی زندگی کے ساتھ اس کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا تھا"۔(6)

مصنف خطوط کی سماجی تاریخ بیان کرتے ہوئے آگے کہتے ہیں" اگر ہم اپنے خطے کی بات کریں تو انگریزوں کی آمد سے قبل برصغیر میں پوسٹل نظام خاصا مضبوط تھا۔ پہلے ڈاک سروس بادشاہوں اور حکمرانوں کے زیر استعمال ہوتی تھی۔ پرانے زمانے کے ڈاکیوں یعنی ہرکاروں کے ذریعے پورے ملک میں ترسیل کا عمدہ نظام تھا۔ ایسے شخص کو بطور ہرکارہ متعین کیا جاتا تھا، جو ہر قسم کی سرگرمیاں انجام دینے کے قابل ہوتا تھا۔ وہ موسیقی کے آلات کے ساتھ ساتھ تلوار اور نیزوں کا استعمال بھی بخوبی جانتا تھا اور تیز دوڑنے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ ہرکاروں کے لیے تیز دوڑنا، آلات حرب وضرب کو چلانا اس لئے ضروری ہوتا تھا کیونکہ ان کو دریاؤں اور گھنے جنگلوں کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ ان کا سامنا کسی جانور یا ڈاکو سے ہو سکتا تھا۔ لیکن ہرکارے کو پوسٹ مین بنانے اور اس کو آلات حرب وضرب کے بجائے بس گھنٹی بجانے کا کام دینا برطانوی راج کی دین ہے۔ انگریزوں نے ہی کمپنی ڈاک سروس کا آغاز کیا۔ ڈاک کا نظام ایک تاریخی اور عالمی نظام ہے، اس نظام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا تاریخی حوالہ آج سے 7000 سال پہلے فرعون مصر کے ابتدائی دور سے ملتا ہے۔ عہد بابل میں تازہ دم اونٹوں اور گھوڑوں کے ذریعے سرکاری اور نجی ڈاک ایک شہر سے دوسرے شہر پہنچانے کا کام انجام دیا جاتا تھا۔

پوسٹ آفس برصغیر میں سب سے قدیم سرکاری محکموں میں سے ایک ہے۔ برصغیر میں پہلا ڈاک خانہ 1837 میں قیام پذیر ہو چکا تھا لیکن ایک طویل عرصے تک برطانوی ڈاک ٹکٹوں سے کام چلایا جاتا رہا ہے اور بالآخر 1852 میں پہلا ڈاک ٹکٹ سر بارٹلے فریئر نے جاری کیا۔ یہ ڈاک ٹکٹ دراصل 'سندھ ڈاک' نامی لفظ کا برطانوی تلفظ تھا، انگریزوں نے جب سندھ فتح کیا تو یہاں موجود ڈاک کا قدیم نظام ان کی ملٹری ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناکافی تھا جس کے سبب انہوں نے ڈاک کا جدید نظام وضع کیا۔ پاکستان بننے کے بعد 15 اگست 1947 سے پاکستان پوسٹ نے لاہور سے اپنا کام شروع کیا، اسی سال پاکستان یونیورسل پوسٹل یونین کا 79 واں رکن بنا۔ 1948 میں پاکستان پوسٹ نے ملک کے پہلے جشن آزادی کے موقع پر اپنے پہلے یادگاری ٹکٹ شائع کیے۔ 1962 میں اسے ٹیلی گراف اینڈ ٹیلی فون سے الگ کر دیا گیا اور ڈاک کا الگ محکمہ بنا دیا گیا۔

اس وقت پاکستان پوسٹ کم وبیش 13 ہزار ڈاک خانوں کے ایک نیٹ ورک کے ذریعے ملک کے ہر کونے میں نہ صرف پوسٹل سروسز فراہم کر رہا ہے بلکہ بجلی، پانی، سوئی گیس اور ٹیلی فون کے بل جمع کرتا ہے۔ بچت بینک، پوسٹل لائف انشورنس اور ٹیکس کے معاملات بھی سر انجام دیتا ہے۔ شعبہ

ادب سے وابستہ افراد خط کو آدھی ملاقات کہتے ہیں۔ دور جدید میں ترقی کے سفر میں جہاں فاصلے سمٹ گئے وہیں پیغام رسانی کے ذرائع میں بھی جدت آتی گئی۔ خط کی بجائے فیکس، لینڈ لائن فون، موبائل فون، انٹرنیٹ، ای میل اور اب ٹیکسٹ بھیجنے کی سینکڑوں ایپس کے آنے سے ڈاکیے اور ڈاک کے نظام کی اہمیت میں کمی آئی ہے۔

چٹھی بھیجنے یا پیغام رسانی کی تاریخ بھی کچھ عجیب سی ہے۔ پہلے خطوط یا پیغام بھیجنے کے لئے پالتو کبوتروں کو باقاعدہ طور پر تربیت دے کر استعمال کیا جاتا تھا۔ وہ کبوتر دور دراز تک اڑان بھر کر پیغام پہنچانے کا کام کرتے تھے۔ انہیں صرف گھروں میں پیغام پہنچانے کے لئے ہی نہیں بلکہ میدان جنگ میں پیغام رسانی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد پیغام رسانی کے اس سلسلے کو مختلف انداز میں اپنایا گیا۔ اگر لفظ پوسٹ پر غور کیا جائے تو یہ لفظ فرانسیسی زبان کے لفظ پوسٹی سے ماخوذ ہے جس کے معنی ایک مخصوص جگہ کے ہیں۔ اگر ڈاک کی تاریخ کی بات کریں تو ڈاک کا آغاز 2000 قبل مسیح میں ایک چینی بادشاہ نے کیا تھا۔ اس نے گھوڑوں اور خچروں کی مدد سے ڈاک کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا کام کیا۔ ہمارے خطے میں شیر شاہ سوری نے اسے مزید وسعت دی اور سندھ سے بنگال تک ڈاک کا ایک مکمل نظام تشکیل دیا۔ اس نظام کے تحت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تازہ دم گھوڑے پڑاؤ تبدیل کرتے ہوئے خطوط کو اپنی منزل مقصود تک پہنچاتے تھے۔ خط پہنچانے کا یہ نظام سرکاری ضروریات کو پورا کرنے کیلئے کئی معاشروں میں موجود تھا لیکن شیر شاہ سوری نے اس طریقہ کار اور سہولت کو عوام کیلئے متعارف کرایا۔ مورخین کہتے ہیں کہ ملکہ برطانیہ الزبتھ نے بھی شاہی میل کا ایک باقاعدہ نظام بنایا تھا۔ جہاں تک سندھ کی بات ہے تو یہاں انگریزوں نے باقاعدہ طور پر اس نظام کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا"۔(7)

انور خان لودھی نے پاکستان میں خطوط نویسی کے عمل کو دم توڑتی روایت قرار دیا ہے، اس ضمن میں لودھی کا کہنا ہے کہ " انگریز کمشنر سر بارٹلے فریئر نے نہ صرف ڈاک کا مکمل نظام بنایا بلکہ 1852 میں ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا جو کہ سرخ رنگ کا تھا اور اس پر سندھ ڈسٹرکٹ ڈاک درج تھا۔ اس ڈاک ٹکٹ کی قیمت آدھا آنہ مقرر کی گئی تھی۔ سندھ میں بھی کبوتروں، پیادوں، گھوڑوں اور خچروں کے ذریعے خطوط بھیجنے کا سلسلہ قائم تھا جو کہ بارٹلے کے نظام کے بعد مزید ایڈوانس ہو گیا۔ بعد ازاں برصغیر پاک وہند میں پوسٹ آفس ایکٹ 1898 کے تحت ڈاک کا جدید نظام قائم کیا گیا۔ پاکستان بن گیا تو 9 جولائی 1948 کو پاکستان زندہ باد کے نعروں سے مزین ٹکٹ چھاپا گیا اور اس کے بعد گویا ملک میں ڈاکخانوں کی قطاریں لگ گئیں اور خطوط لکھنے والے لوگوں کی تعداد میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا۔ پہلے لوگ صبح سویرے بیدار ہوتے تو ڈاکیے کا بیتابی سے انتظار کیا کرتے تھے۔ اگر ڈاکیا کوئی خوشخبری والا خط لے آتا تو لوگ اس کی تواضع کرتے اور انعام واکرام سے بھی نوازتے تھے۔ اگر کسی محلے میں کوئی ٹیلی گرام آجاتا تو پورے علاقے

میں ایک کہرام مچا ہوتا تھا کہ کوئی بری خبر آئی ہے، کیونکہ لوگ اس وقت صرف کسی کی وفات کی صورت میں ٹیلی گرام بھیجا کرتے تھے۔ پاکستان میں محکمہ ڈاک اب بھی ملک بھر میں ڈاک کی ترسیل کا وہ واحد ادارہ ہے جس کے ڈاکخانے چھوٹے چھوٹے دیہات اور قصبوں میں بھی قائم ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی کو فوجی بھائیوں کو ان کی چھاؤنی یا دور پہاڑوں میں گلیشیر پر پیغام بھیجنا ہو تو صرف محکمہ ڈاک ہی یہ کام سرانجام دے سکتا ہے۔ محکمہ ڈاک پاکستان میں اب تک تقریباً ایک ہزار سے زائد ڈاک ٹکٹ جاری کر چکا ہے۔ ان پر بادشاہوں اور مشہور شخصیات کی تصاویر ہیں، عمارتوں کی تصویریں ہیں اور ان ٹکٹوں میں موضوعات کا تنوع نظر آتا ہے۔ 2006 کی بات ہے پاکستان کے پہلے ڈاک ٹکٹ سے لے کر دو ہزار چھ کے پہلے مہینہ تک جاری کیے گئے بارہ سو پچاس ٹکٹوں کا ایک رنگین کیٹلاگ لاہور سے شائع کیا گیا اور ان لوگوں کو جو اصل پرانے ٹکٹ حاصل نہیں کر سکتے تھے انہیں اس کے ذریعے ان ٹکٹوں تک رسائی ملی۔ ڈاک ٹکٹوں کا یہ کیٹلاگ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان وجود میں آیا تو فوری طور پر برطانوی عہد کے ٹکٹوں پر پاکستان کا لفظ بڑا بڑا شائع کر کے انہیں ملک کے پہلے عبوری ٹکٹوں کے طور پر استعمال کیا گیا اور بعد میں کراچی میں ان ٹکٹوں کو دوبارہ چھاپا کیا گیا۔

پوسٹل یونین نے اپنے طے کردہ معیار کے مطابق سوئٹزرلینڈ کے ڈاک کے نظام کو بہترین قرار دیا ہے۔ پہلے دس بہترین ممالک میں آسٹریا دوسرے، جرمنی تیسرے نمبر پہ ہے۔ اس کے بعد کی ترتیب میں نیدرلینڈز، جاپان، فرانس، امریکہ، برطانیہ، کینیڈا اور سنگاپور کے ڈاک کے نظام شاندار قرار دیئے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا اپنے رنگ بدلتی ہے۔ خط لکھنا محض روایت نہیں بلکہ ضرورت تھا جس کا اب کم ہی تذکرہ ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے نئی نسل کے بہت سے لوگوں نے ڈاکئے کی شکل بھی نہ دیکھی ہو لیکن خطوط نویسی کا یہ سلسلہ اس طرح ختم نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے جہاں دیگر نقصانات ہیں وہیں لوگوں میں لکھنے پڑھنے کی ایک جاندار روایت کا خاتمہ بھی نظر آتا ہے"۔(8)

خطوط کی ترسیل میں اگر پرندوں کے کردار کا تذکرہ کیا جائے تو قرآن مجید کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط لے جانے والا بھی ایک پرندہ تھا جسے ہدہد کہا جاتا ہے۔ یہ خوبصورت پرندہ پاکستان کے ہر گاؤں اور شہر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہدہد کا ذکر قرآن پاک میں سورہ النمل کی آیت 22 میں آیا ہے۔ حضرت سلمان اور ہدہد کی بات چیت کا ذکر اس طرح ہے ایک مرتبہ سلیمان (علیہ السلام) اپنے دربار میں پورے جاہ وجلال کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ انسان، جنات، حیوانات کے نمائندے بھی موجود تھے لیکن پرندوں میں ہدہد موجود نہ تھا۔ فرمایا کیا بات ہے کہ میں ہدہد کو موجود نہیں پاتا؟ اگر وہ واقعی غیر حاضر ہے تو اس کو سخت سزا دوں گا یا پھر ذبح کر ڈالوں گا۔ الاّ یہ کہ وہ اپنی غیر حاضری کی معقول وجہ بیان کرے۔ اسی غضب میں تھے

کہ ہدہد حاضر ہو گیا اور حضرت سلیمان کے سوال پر کہنے لگا کہ میں ایک یقینی خبر لایا ہوں جسے آپ نہیں جانتے۔ وہ یہ ہے کہ سبا کے ملک پر ایک ملکہ حکمرانی کرتی ہے۔ اللہ نے اس کو سب کچھ دے رکھا ہے اور اس کا تخت نہایت عظیم الشان ہے ملکہ اور اس کی قوم سورج کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ الٰہ واحد کی عبادت نہیں کرتے شیطان نے ان کی سورج پرستی کو ان کے لیے خوشنما بنا دیا ہے۔ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے یہ خبر سن کر فرمایا کہ تیری سچائی کا ابھی علم ہو جائے گا۔ میرا خط لے جا اور اس کو ان تک پہنچا اور انتظار کر کہ وہ اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ ہدہد خط لے کر اڑا اور خط ملکہ کے سامنے پھینک دیا ملکہ خط پڑھ کر اہل دربار سے کہنے لگی کہ ابھی ابھی یہ خط سلیمان کی جانب سے آیا ہے۔ جو اللہ کے نام سے شروع کیا گیا ہے جو بڑا مہربان رحم فرمانے والا ہے۔'' خط کا مضمون یہ ہے کہ تم سرکشی کا اظہار نہ کرو اور میرے پاس تابعدار ہو کر آجاؤ۔(9) وزیروں مشیروں نے کہا جہاں تک مرعوب ہونے کا تعلق ہے اس کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم طاقتور اور جنگی قوت کے مالک ہیں البتہ آخری فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے جو مناسب سمجھیں فیصلہ فرمائیں۔ ملکہ نے کہا بیشک ہم طاقتور ہیں لیکن سلیمان کے معاملے میں ہمیں جلدی نہیں کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ پہلے اپنے نمائندے بھیجوں جو اس کی خدمت میں تحائف پیش کریں۔ اس سے اس کی شان و شوکت اور مزاج کا اندازہ لگائیں کہ وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ اگر واقعی قوت و شوکت کے مالک ہیں تو پھر ان سے لڑنا فضول ہے۔ کیونکہ فاتح بادشاہوں کا وتیرہ ہوتا ہے کہ جب وہ کسی شہر میں فاتحانہ طور پر داخل ہوتے ہیں تو اس شہر کو برباد اور باعزت شہریوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔(10) قاضی ثناء اللہ نے ذکر کیا کہ یہ ہدہد یمن کے ہدہد سے خبر لایا تھا ہدہد سلیمان (علیہ السلام) کا نام یعفور اور ہدہد یمن کا نام عنفیر تھا۔(11) سبا ایک قوم کا نام ہے جو یمن میں صنعا سے قریب آباد تھی اور جس کا دارالسلطنت مآرب تھا۔(12)

آج بھی ریاستوں کے حکمران دوسرے حکمرانوں کو خطوط لکھتے ہیں اور یہ عمل بہت معتبر سمجھا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے پاکستان کی سیاست میں ہنگامی صورتحال برپا ہوئی جب پاکستان کے سابق وزیراعظم عمران خان نے امریکہ کی جانب سے انہیں بھیجے گئے سائفر کا تذکرہ کیا اور ایک علامتی کاغذ عوامی جلسوں میں لہرا کر قوم کو یہ باور کرایا کہ ان کی حکومت کو امریکی سازش کے سبب ہٹایا گیا، یہ سائفر بھی عوام ہاتھ سے لکھا ہوا خط ہی سمجھتے تھے تاہم عمران خان کا ہوا میں خط لہرانا بھی ایک بہت بڑے مجمع کو مسحور کر دیتا تھا۔

لکھنے کے عمل میں غلطی بھی ہو سکتی ہے، بقول شاعر

وہ دعا لکھتے رہے، ہم دغا پڑھتے رہے ایک نقطے نے محرم سے مجرم بنا دیا

شعراء نے اردو شاعری میں بھی خطوط کو بہت اہمیت دی ہے۔ اجمل صدیقی لکھتے ہیں کہ

خط جو تیرے نام لکھا، تکیے میں چھپا کے رکھتا ہوں
جانے کس امید پہ یہ تعویذ دبا کے رکھتا ہوں
تا کہ اک اک لفظ مرے لہجے میں تجھ سے بات کرے
خط کے ہر ہر لفظ کو خط پر خوب پڑھا کے رکھتا ہوں
آس پہ تیری بکھرا دیتا ہوں کمرے کی سب چیزیں
آس بکھرنے پر سب چیزیں خود ہی اٹھا کے رکھتا ہوں (13)

اب ہم تذکرہ کرتے ہیں کچھ اردو غزلوں اور گیتوں کا، جن میں محبوب کے خطوط کا تذکرہ کر کے سامعین کے دل کے تار چھونے کا سبب پیدا کیا جاتا رہا اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ یہ گیت پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں میں لکھے اور گائے گئے۔ اس ضمن میں بھارتی فلم " بے خودی " کا یہ گیت بڑی شہرت کا حامل ہے۔ یہ فلم سن 1992 میں ریلیز ہوئی جب کہ اس کے گانے والے بھارت کے مشہور ترین گلوکار کمار سانو اور عاشا بھوسلے تھی۔ ندیم شیروان نے اس کا میوزک ترتیب دیا تھا۔ ان اشعار کو لکھنے والے شاعر انور ساگر ہیں۔ گیت کے بول کچھ اس طرح سے ہیں۔

جب سے نہ مانا دل دیوانہ
قلم اٹھا کے جان جاناں
خط میں نے تیرے نام لکھا
حال دل تمام لکھا
کاغذ کے اس ٹکرے کو تم دل سمجھ لینا
جہاں بوند گری ہو سیاہی کی اسے دل سمجھ لینا
یادوں میں ڈوب کے
کاغذ کو چوم کے
پیار کا تجھ کو سلام لکھا
حال دل تمام لکھا
میں نے دل سے لاکھ کہا کہ اتنا تڑپنا ٹھیک نہیں
ایسے کسی کے پیار میں پاگل تیرا مچلنا ٹھیک نہیں
دل بولا مجبوری ہے
خط لکھنا ضروری ہے

دل ہوا تیرا غلام لکھا
حال دل تمام لکھا
پیار کا ایسا اثر بھی ہو گا یہ مجھے معلوم نہ تھا
اتنا درد جگر بھی ہو گا یہ مجھے معلوم نہ تھا
میں نے دل تھام کے
آج تیرے نام سے
پیار کا پہلا پیام لکھا
حال دل تمام لکھا
جب سنہ مانا دل دیوانہ

وہ کیا دور تھا جب محبوب کے خط چومے جاتے تھے، انہیں تکیوں کے نیچے اور لحافوں میں چھپا کے رکھا جاتا تھا۔ میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ جب وہ چھوٹا بچہ تھا اور ٹیوشن والی باجی کے پاس شام کو پڑھنے جاتا تھا تو راستے میں کوئی بندہ اسے ایک کاغذ پکڑا دیا کرتا اور رازداری سے کہتا یہ چھپا کر باجی کو دے دینا اور وہ تمیز دار اور سلیقہ دار بچے کی حیثیت سے ایک عرصہ تک یہ ذمہ داری انجام دیتے رہے۔ جب خود محبت کرنے کی عمر کو پہنچا تو احساس ہوا کہ اس نے کم سنی میں ہی اپنے کاندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری طویل مدت تک اٹھانے کا قومی فریضہ سر انجام دیا۔ بہر حال محبوب کو لکھے جانے والے خطوط کی خوشبو روحانی طور پر محسوس کی جاتی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ مائیں اور بہنیں لکھنے والوں کی موت کے بعد بھی ان کے خطوط کو آنکھوں سے لگایا کرتیں۔

حسنین جمال خط لکھنے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اپنے ایک بہت خوبصورت مضمون " خط والی باتیں فونوں پہ نہیں ہوتیں"، میں لکھتے ہیں کہ

"ایسے میں اتنے انتظاروں اور دعاؤں کے بعد ہاتھ آیا کاغذ کا وہ ٹکڑا دل و جان سے پیارا ہو جایا کرتا تھا۔ انتہائی قریب لوگوں کی دوری سے آدھے مر چکے لوگوں کو تھوڑی بہت زندگی اس کاغذ کو چھونے سے مل جاتی تھی، جسے خط کہتے ہیں۔

خط چومے جاتے، ان کی خوشبو محسوس کی جاتی، انہیں آنکھوں سے لگایا جاتا، سینے کے ساتھ باندھ لیا جاتا اور وہ ایک بے جان پرزہ کئی مرتبہ راتوں کو جیتا جاگتا وجود بھی بن جایا کرتا۔

میں نے ساری زندگی کاروباری پیغاموں کے علاوہ خط یا کارڈ کسی کو پھینکتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ نے دیکھا ہے کیا؟

موبائل فون پر ویڈیو کال کرتے ہوئے ماں بیٹے سے بات کر سکتی ہے، اس کی شکل دیکھ سکتی ہے لیکن اسے محسوس نہیں کر سکتی، الٹا تڑپ مزید بڑھ جاتی ہے۔ وہ جو اولاد کو یا میاں بیوی کو، بہن بھائی کو، محبوب کو چھو لینا ممکن ہوتا تھا وہ لمس کی حس یا کہہ لیجیے تعلق کی تیسری ڈائمینشن صرف خط میں ہی پوری ہوتی تھی۔ آپ کبھی فون کال ریکارڈ کر کے دیکھ لیں۔ زیادہ تر باتیں روزمرہ کی ہوں گی، سب کے حال چال پوچھے جائیں گے، موسم ہو گا، خاندان کا حال حوال ہو گا، تازہ واقعات ہوں گے اور تقریباً ایک جیسی باتیں ہر دو چار دن کے وقفے سے دہرائی جا رہی ہوں گی۔ خطوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔

خط لکھنے والا پوری طرح کمپوزڈ ہو کے بیٹھتا تھا، دماغ پہ زور دے کر عبارت لکھی جاتی تھی، پھر اس میں کئی باتیں ایسی بھی ہوتی تھیں جو فون پر ممکن ہی نہیں ہیں۔ زندگی کے فلسفے ہوتے تھے، شاعری ہوتی تھی، پچھلے کئی ہفتوں کی خاص خاص باتیں ہوتی تھیں، نئے سنے جانے والے گانوں کا تذکرہ ہوتا تھا، مکمل فلم کا خلاصہ لکھ دیا جاتا تھا، اب یہ سب کچھ فیس بک پر ہوتا ہے اور وال پوسٹس کے ملبے تلے کہیں دفن ہو جاتا ہے۔ حالات حاضرہ پر مختصر تبصرہ کرتے ہیں، دوست لائک کمنٹ دیتے ہیں، روح کی خوراک پوری ہوتی ہے اور اگلے دن پھر وہی سب کچھ دہرایا جاتا ہے۔ خطوں کی دنیا اور ڈاک کے زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ فونوں پر مسلسل اور روزانہ بولتے رہنے سے ہمارے پاس کچھ بچتا ہی نہیں بات کرنے کو، اور سنائیں کیا حال ہے، بس" (14)

شہناز پروین سحر نے ایک کہانی کا تذکرہ کرتے ہوئے "پیار کا پہلا خط" کے نام سے ایک مضمون لکھا ہے اس مضمون کا مطالعہ کرنے سے پہلے اہم اس گیت کی جانب آتے ہیں۔ جسے لکھنے والے شاعر ہستی مل ہستی تھے اس غزل کو جگجیت سنگھ نے اپنی آواز دے کر امر کر دیا ہے۔

پیار کا پہلا خط لکھنے میں وقت تو لگتا ہے
نئے پرندوں کو اڑنے میں وقت تو لگتا ہے
جسم کی بات نہیں تھی اُن کے دل تک جانا تھا
لمبی دوری طے کرنے میں وقت تو لگتا ہے
گانٹھ اگر لگ جائے تو پھر رشتے ہوں یا ڈوری
لاکھ کریں کوشش کھلنے میں وقت تو لگتا ہے
ہم نے علاجِ زخمِ دل تو ڈھونڈ لیا لیکن
گہرے زخموں کو بھرنے میں وقت تو لگتا ہے (15)

تنویر گوہر نے اپنے محبوب کو خط لکھنے کے عمل کو یوں اپنے اشعار کی شکل دی ہے۔

میں نے جب جب بھی ترا نام لکھا کاغذ پر
یوں لگا جیسے کوئی پھول کھلا کاغذ پر

ایک مدت سے ملاقات کو بے چین ہے دل
بھیج دے لکھ کے مجھے اپنا پتا کاغذ پر
خط ترا جب بھی کوئی میں نے پرانا کھولا
تو ابھر آیا حسیں نقش ترا کاغذ پر
لکھنے بیٹھا ہوں ترے نام کوئی خط جب بھی
آنکھ سے اشک گرا ثبت ہوا کاغذ پر
چارہ گر آ کہ سوا درد جگر ہوتا ہے
بھیج دے لکھ کے مجھے ورنہ دوا کاغذ پر
تجھ کو اظہار محبت کی قسم اتنا بتا
بے وفا کیوں کیا اظہار وفا کاغذ پر (16)

دور جدید میں محبوب کے ساتھ سارے رابطے موبائل پر بذریعہ کال اور میسیج منتقل ہو گئے ہیں۔ 1992 میں ریلیز ہونے والے ایک فلمی گیت میں محبوب کو ٹیلی فون کرنے کا ذکر کر کے فلم کو بہت خوبصورت بنا دیا گیا تھا۔ اس فلم کا نام تیاگی تھا جب کہ یہ گیت گانے والے نامور گلوکار کمار سانو اور سپنا مکرجی تھے۔ اس گیت کی شاعری "کے کے ورما" نے لکھی تھی۔ اس گیت کی شاعری اس طرح سے ہے:

ہیلو ہیلو، ہائے، ہیلو، ۔ ہم تنہا دل گبرتا ہے۔
میٹھا درد جگتا ہے۔ آجاؤ تم جلدی سے
اس لیے میں نے ٹیلی فون کیا ہے۔ اس لیے میں نے ٹیلی فون کیا ہے۔
ہیلو ہیلو ہیلو ہیلو
ابھی تو گھر پہ ڈیڈی ہیں۔ ابھی نہیں میں آ نہیں سکتی
دل کو ذرا سنبھالو ناں۔ ابھی تو مل کے آئی ہوں
ابھی تو گھر پہ ڈیڈی ہیں۔ ابھی نہیں میں آ نہیں سکتی
دل کو ذرا سنبھالو ناں۔ ابھی تو مل کے آئی ہوں
پھر کس لیے تم نے ٹیلی فون کیا ہے۔ پھر کس لیے تم نے ٹیلی فون کیا ہے
ہیلو ہیلو ہیلو ہیلو۔ بولو، ہیلو، بولو ناں
ستائو نہ دیکھو دیوانے بن کے۔ آجائو کوئی بہانہ بنا کے
ستائو نہ دیکھو دیوانے بن کے۔ آجائو کوئی بہانہ بنا کے

تھوڑی کریں گے پیار کی بات۔ چلی جانا میرا دل بہلا کے
پل پل مجھے جلاتا ہے، تیری یاد دلاتا ہے۔ آجاؤ تم جلدی سے، دم گھٹتا سا جاتا ہے۔
اس لیے میں نے ٹیلی فون کیا ہے۔ دیکھو نہ کیا موسم ہے۔
آجاو۔۔نا۔۔نا۔۔بابا۔۔۔نا
یہی تو مشکل ہے۔ کیا کروں سمجھ نہیں آتا ہے،
میرے بنا تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔ کیا کرو سماج نہیں آتا ہے۔
تم سے ملنے کا، میرا ابھی مان ہے۔ میری مجبوری مجھ سے، روکے بتونے ہیں
کیسے تمھیں بتائوں میں۔ مجھ سے رہا نہیں جاتا ہے۔
کیسے سمجھاوں، ابھی تو مل کے آئی ہوں۔ پھر کس لیے تم نے ٹیلی فون کیا ہے۔
اچھا بابا۔۔اب بند بھی کرو، تو کل ملوں گی۔ ہا۔۔وعدہ۔۔آئی لو۔۔یو۔۔آئی۔۔ٹو

کبھی کبھی اس گیت جیسے گیتوں نے فلموں کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ اگرچہ اس فلمی گیت میں ٹیلی فون پر ہونے والی بات چیت کو شاعری کی شکل دے کر محبت کے جذبات کی ترجمانی کی گئی۔ تاہم محبت کی کہانیوں سے بھر پور فلموں میں جب کوئی اپنے محبوب کی یاد میں تڑپتا ہے تو گیت گنگنا کے محبوب کے خطوط کو یاد کرتا ہے۔

پاکستان کی ایک مشہور اردو فلم میں ناہید اختر کا گایا ہوا یہ گیت بہت مقبول ہوا۔

میرے محبوب کا آیا ہے محبت نامہ۔ وہ خوشی دل کو ملی ہے کہ بتا بھی نہ سکوں
وہ خوشی دل کو ملی ہے کہ بتا بھی نہ سکوں۔ اِس پیار کے جذبے کو چھپا بھی نہ سکوں
میرے محبوب کا...
میرے محبوب کا آیا ہے محبت نامہ۔ اُس نے لکھا ہے، "میری جان، سلامِ الفت
آرزوؤں بھرا یہ خط ہے بہ نامِ الفت۔ مجھ سے ملنے کے لیے دل تو دھڑکتا ہو گا
پیار کا شعلہ بھی سینے میں بھڑکتا ہو گا۔ میں اُسے کیسے لکھوں...
میں اُسے کیسے لکھوں، دل میرا گھبراتا ہے۔ پیار ہو جائے تو کب تنہا رہا جاتا ہے
میرے محبوب کا... میرے محبوب کا آیا ہے محبت نامہ

ناہید اختر کی آواز نے اس شاعری کو انتہائی بلند شہرت عطا کی۔ اس فلم کا نام تھا "شمع محبت" ۔ اور یہ فلم 1977 میں ریلیز ہوئی۔ ناہید اختر کی آواز کے ساتھ یہ گیت اداکارہ شبنم پر فلمایا گیا۔ بنیادی طور پر یہ فلم پاکستانی معاشرے میں محبت کی تلاش میں ایک رومانوی فلم تھی اور اس کے سبھی گیت بہت شاندار تھے۔(17)

اس شاہکار گیت کے شاعر تسلیم فضلی تھے جنہوں نے محبوب کے خط کی اہمیت کو ایک گیت میں خوبصورت انداز میں سمونے کی کوشش کی۔ آگے چل کر گیت کے الفاظ کچھ یوں ہیں۔

اُس نے پوچھا ہے کہ، "دن کیسے بسر ہوتا ہے؟ کبھی میرا بھی خیالوں میں گزر ہوتا ہے؟
میں تمھارے لیے، اے جانِ وفا، کیا لاؤں؟ کانچ کی چوڑیاں یا سونے کا کنگنا لاؤں؟"

اور پھر اسی گیت میں فضلی صاحب نے محبوبہ کا جواب کچھ ایسے اشعار میں درج کیا کہ اس گیت کو سنتے ہیں دلوں میں محبت کے شعلے بھڑک جائیں۔

میں اُسے لکھ دوں گی...

میں اُسے لکھ دوں گی، میرے لیے کچھ مت لاؤ۔۔ میرا تحفہ ہو تمھیں، لوٹ کے تم آجاؤ
میرے محبوب کا آیا ہے محبت نامہ۔۔۔ وہ خوشی دل کو ملی ہے کہ بتا بھی نہ سکوں
اور اِس پیار کے جذبے کو چھپا بھی نہ سکوں
میرے محبوب کا.....میرے محبوب کا آیا ہے محبت نامہ

شہناز پروین سحر اپنے مضمون پیار کا پہلا خط میں لکھتی ہیں:

"ہر کسی کی زندگی میں ایک نہ ایک "پہلا خط" ضرور ہوتا ہے۔ میں نے جب نیا نیا لکھنا شروع کیا تو ہر وقت خود کو آزمائش میں ڈالے رکھتی۔ امی ابو سے سنے گئے لفظ، کسی نہ کسی آئے گئے سے سنی گئی بات، ریڈیو، گیت، غرض کان میں پڑنے والی ہر آواز کے ہر لفظ کے بارے چونک جاتی۔ اچھا تو کیا یہ لفظ، لکھے بھی جا سکتے ہیں۔

یہ انڈین فلموں کے معروف ہیرو دلیپ کمار صاحب تھے جن کو میں نے اپنی جانب سے زندگی کا پہلا خط لکھا تھا۔

میں نے اپنے ابو سے ایک دن سنا تھا کہ ان کا ایڈریس B 32، پالی ہل، باندرہ، بمبئی، ہے۔ اور میں نے ان کا ایڈریس یاد کر کے اپنی سکول کی ایک کتاب کی پشت پر لکھا اور سنبھال لیا، بس۔ اب مجھے خط لکھنا تھا دلیپ کمار صاحب کو۔

پھر یوں ہوا کہ دلیپ کمار صاحب کو خط لکھا، اور بڑے پیار سے "بہت پیارے انکل" کہہ کر مخاطب کیا، میں نے ان کو بتایا کہ ہم سب گھر والے آپ کی فلم دیکھتے ہیں آپ مجھے اور میرے ابو کو بہت پسند ہیں، اس لیے آپ مجھ سے، اور میرے ابو سے ملنے پاکستان ضرور آئیں، ہم آپ کا انتظار کریں گے، میری امی نے آم کا مزیدار اچار بنایا ہوا ہے میں وہ اچار آپ کو بھی کھلاؤں گی۔

خط لکھ کر جواب کا کچھ دنوں تک شدت سے انتظار کیا لیکن پھر بھول گئی کہ میں نے دلیپ کمار صاحب کو کوئی خط لکھا تھا۔

ایک دن سکول سے آئی تو سارے محلے میں شور مچا ہوا تھا کہ دلیپ کمار نے شہناز کو خط لکھا۔ دلیپ کمار نے خط بھیجا۔ ڈاکیے نے دلیپ کمار کے خط کا ڈھنڈورا سارے محلے میں خوب اچھی طرح پیٹ دیا تھا۔

یہ سطور میں لکھ رہی ہوں اور کانوں میں کسی گیت کی گونج سسک رہی ہے"۔ (18)

1992 میں ریلیز ہونے والی بھارتی فلم "جگر" میں بھی ایسا ہی ایک گیت شامل ہوا جس کی شاعری فروغ صدیق نے لکھی تھی۔ اس کے گلوکار ابھیجیت بھٹاچاریہ اور ساتو نے اسر گم تھے جنہوں نے بہت سریلی آواز میں گیت گا کر محبت ناموں کی یاد تازہ کر دی۔ اس رومانوی گیت کی شاعری کچھ اس طرح ہے:

پیار کے کاغذ پہ دل کے قلم سے۔ پہلی بار سلام لکھا۔
میں نے خط محبوب کے نام لکھا۔ پیار کے کاغذ پہ دل کے قلم سے
پہلی بار سلام لکھا۔ میں نے خط محبوب کے نام لکھا
یادوں میں دن کاٹتی تھی۔ اور نہ گزرتی تھی راتیں
کیسے بھلا میں بتائوں۔ تجھ کو جدائی کی باتیں
رنگ لائی تھی بیقراری۔ ایسی چھائی تھی خماری۔
میں نے صبح کو شام لکھا۔
تیرے گلابی لبوں سے۔ شبنم کے دانے چرائوں
جو بات خط میں لکھی نہ۔ آجا تجھے میں بتائوں

اس گیت کی شاعری میں فروغ صدیق نے محبوبہ کی نفسیاتی کیفت کو مہارت سے بیان کیا ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ لڑکی محبت کا اظہار کرنے سے بھی ڈرتی ہے اور چاہتی ہے کہ بغیر اظہار کے اس کا محبوب اس کی محبت اور چاہت کو سمجھ جائے لیکن اپنے محبت کا اظہار کیے بغیر رہ بھی نہیں سکتی۔ اسی لیے گیت کا اختتام ان اشعار سے ہوتا ہے۔

یوں ہی آنہیں بھرتے بھرتے۔ توبہ میں نے ڈرتے ڈرتے
الفت کا پیام لکھا۔ الفت کا پیام لکھا
میں نے خط محبوب کے نام لکھا۔ میں نے خط محبوب کے نام لکھا
پیار کے کاغذ پہ دل کے کلام سے۔ پیار کے کاغذ پہ دل کے کلام سے
پہلی بار سلام لکھا۔ پہلی بار سلام لکھا۔

محبوب کے نام خط لکھنے کے حوالے سے گیتوں میں جہاں دوسرے گلوکاروں نے کمال کے گیت گائے، وہاں لتا منگیشتر بھلا کیسے پیچھے رہ سکتی تھی ایک گیت میں محمد عزیز نے ان کا ساتھ دیا جسے جاوید اختر نے لکھا تھا۔ بھارتی فلم "کھیل" میں شامل یہ گیت انیل کپور اور مادھوری پر فلمایا گیا تھا۔ یہ فلم 1992 میں ریلیز ہوئی۔ اس گیت کے بول کچھ ان الفاظ میں تھے۔

خط لکھنا ہے پر سوچتی ہوں۔ یہ کیسے لکھوں مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔

مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔

میری مانو، اتنا لکھ دو۔ میری مانو اتنا لکھ دو

میری آنکھوں پر خوابوں کی عنایت ہو گئی ہے

کاغذ قلم جیسے ہی اٹھاوں۔ دل ہے کے دھڑکے جائے۔

جو بھی لکھو تم دل کی باتیں۔ اب نہ چھپیں گی چھپائے

میں اچھی ہوں یہ تو لکھ دوں میں اچھی ہوں یہ تو لکھ دوں

یہ کیسے لکھوں؟ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔

یہ سوچا ہے اتنا لکھ دوں۔ کچھ دن سے مجھے کیا جانے کیوں

یہ دنیا حسین لگتی ہے۔

1994 میں ریلیز ہونے والی بھارتی فلم خوددار میں شامل یہ گیت بھی محبت کرنے والے ایک جوڑے کے درمیان عہد و پیمان کی نشاندہی کرتا ہے جو ایک دوسرے کو خط لکھنے کا وعدہ کر رہے ہیں۔

خط لکھنا ہمیں خط لکھنا۔ خط لکھنا بابا خط لکھنا

دل سے ہو جائو جب مجبور تو ہم کو خط لکھنا پیار ہونے لگے مشہور تو ہم کو خط لکھنا

ہو جائو جب مجبور تو ہم کو خط لکھنا پیار ہونے لگے مشہور تو ہم کو خط لکھنا

گائوں میں پک جائیں جب انگور تو ہم کو خط لکھنا ----------

اور ہو جائو جب معرور تو ہم کو خط لکھنا پیار ہونے لگے مشہور تو ہم کو خط لکھنا

ایک اور بھارتی فلم "فرسٹ لو لیٹر" میں "کاٹ کے انگلی" کے عنوان سے اردو گیت محبوب کو محبت نامے لکھنے کی اہمیت بیان کرتا ہے اور محبوبہ کی جدائی میں محسوس ہونے والے درد کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے۔

کاٹ کے انگلی قلم بنالوں دل کے لبوں سے لکھ دوں نام تیرے لو لیٹر، لو لیٹر

رت آئے رت جائے لائے نہ کوئی تیری خبر

ہر پل میں مانگوں دعا دیکھ تجھے تیرے دیکھ نظر

جی نہ سکوں نہ مر پائوں　　دیوانہ میں ہو جائوں
کاٹ کے انگلی قلم بنائوں　　دل کے لبوں سے لکھ دوں نام تیرے　　لو لیٹر لو لیٹر

لتا منگیشتر اور سوریش ودکار کا ایک محبت بھرا گیت جسے 1986 میں ریلیز ہونے والی بھارتی فلم "پالے خان" میں شامل کیا گیا تھا، محبوب کے محبت ناموں کی اہمیت اجاگر کرتا ہے۔ اس کی شاعری آنند بخشی نے لکھی تھی۔ گیت کے بول کچھ اس طرح سے تھے۔

ہو میرے صنم تیرا خط ملا۔　　خط میں تو نے خط لکھنے کو لکھا
خط کے بدلے میں آ گئی۔　　خط کے بدلے میں آ گئی۔
ہو میرے صنم تیرا خط ملا۔　　خط میں تو نے خط لکھنے کو لکھا
خط سے پہلے میں آ گیا۔　　خط سے پہلے میں آ گیا۔
تیری جدائی سہ نہ سکی میں۔　　تیری جدائی سہ نہ سکی میں
تجھ سے ملے بن رہ نہ سکی میں　　او تو نے کہا جو کہ نہ سکا میں
اے زور سے دل دھڑکا میرا۔　　خط میں تو نے لکھنے کو لکھا
خط سے پہلے میں آ گیا۔　　خط سے پہلے میں آ گیا
آیا ہوا کا ہر ایک جھوکا۔　　آیا ہوا کا ہر ایک جھوکا
تیرا ہی کوئی پیغام لیے کے۔　　اے اتنی محبت مجھ سے نہ کر تو
ارے اتنی محبت مجھ سے نہ کر تو۔　　مر جاوں میں تیرا نام لیے کے
او۔ رکھے سلامت تجھ کو خدا　　خط میں تو نے خط لکھنے کو لکھا
خط کے بدلے میں آ گئی　　خط کے بدلے میں آ گئی۔

اس طرح اردو گیتوں میں اور بھی گیت شامل ہیں جن میں محبوب کے محبت ناموں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جیسے لتا منگیشتر نے بھارتی ہندی فلم "شکتی" کے لیے گایا تھا جو 1982 میں ریلیز ہوئی تھی۔ خط سے متعلق لتا منگیشتر کے اس مسحور کن رومانوی گیت کے شاعر آنند بخشی تھے۔ گیت کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم نے صنم کو خط لکھا، خط میں لکھا
اے دلربا، دل کی گلی، شہرِ وفا
پہنچے یہ خط جانے کہاں، جانے بنے کیا داستاں
اس پر رقیبوں کا یہ ڈر، لگ جائے ان کے ہاتھ اگر
کتنا برا انجام ہو، دل مفت میں بدنام ہو

ایسا نہ ہو، ایسا نہ ہو، اپنے خدا سے رات دن
مانگا کیے ہم یہ دعا
پیپل کا یہ پتا نہیں، کاغذ کا یہ ٹکڑا نہیں
اس دل کا یہ ارماں ہے، اس میں ہماری جان ہے
ایسا غضب ہو جائے نہ، رستے میں یہ کھو جائے نہ
ہم نے بڑی تاکید کی، ڈالا اسے جب ڈاک میں
یہ ڈاک بابو سے کہا
برسوں جوابِ یار کا، دیکھا کیے ہم راستہ
اک دن وہ خط واپس ملا اور ڈاکیئے نے یہ کہا
اس ڈاک خانے میں نہیں، سارے زمانے میں نہیں
کوئی صنم اس نام کا، کوئی گلی اس نام کی
کوئی شہر اس نام کا۔۔۔
ہم نے صنم کو خط لکھا۔۔۔

مشہور بھارتی شاعر "اندیور" نے اپنی شاعری میں محبوب کو خط میں پھول بھیجنے کا تذکرہ کرتے ہوئے پھول کو اپنے دل سے تشبیہ دی تھی۔ اندیور کہتا ہے کہ اس کے خط میں اپنے محبوب کے لیے اتنا پیار چھپا ہوا تھا جتنے سمندر میں موتی چھپے ہوتے ہیں اور یہ موتی نہ تو کبھی ختم ہوں گے نہ ان میں کمی آئے گی۔ مزید کہتا ہے کہ اگر میری محبوبہ میرے پاس ہوتی تو اس کے ہاتھ چوم لیتا۔ اس گیت کے بول ملاحظہ کیجیے۔

پیار چھپا ہے خط میں اتنا
جتنے ساگر میں موتی
چوم ہی لیتا ہاتھ تمہارا
پاس جو تم میرے ہوتی

ان اشعار کو مکیش نے لتا منگیشتر کے ساتھ مل کر گیت میں تبدیل کیا اور یہ گیت فلم "سرسوتی چندرا" میں شامل کیا گیا تھا جو 1968 میں ریلیز ہوئی تھی، اس گیت کی وجہ سے یہ فلم نوجوانوں میں بہت مقبول ہوئی۔ یہ گیت رومانوی دل رکھنے والے جوانوں کے لیے جذبات سے لبریز تھا۔ اس گیت کی مکمل شاعری ان الفاظ میں تھی۔

پھول تمہیں بھیجا ہے خط میں، پھول نہیں میرا دل ہے
پریتم میرے مجھ کو لکھنا، کیا یہ تمہارے قابل ہے

پیار چھپا ہے خط میں اتنا، جتنے ساگر میں موتی
چوم ہی لیتا ہاتھ تمہارا، پاس جو تم میرے ہوتی
نیند تمہیں تو آتی ہوگی، کیا دیکھا تم نے سپنا
آنکھ کھلی تو تنہائی تھی، سپنا ہو نہ سکا اپنا
تنہائی ہم دور کریں گے، لے آؤ تم شہنائی
پریت بڑھا کر بھول نہ جانا، پریت تمہی نے سکھلائی
خط سے جی بھرتا ہی نہیں، اب نین ملے تو چین ملے
چاند ہمارے آنگن اترے، کوئی تو ایسی رین ملے
ملنا ہو تو کیسے ملیں ہم، ملنے کی صورت لکھ دو
نین بچھائے بیٹھے ہیں ہم، کب آؤ گے خط لکھ دو

اس گیت کو جہاں مکیش اور لتا منگیتر جیسے گلوکاروں نے گایا، وہاں نوتن جیسی خوبصورت اداکارہ اور منیش جیسے ہیرو پر فلمایا گیا تھا۔ وہ جو چار چاند لگنے کا محاورہ ہے اس گیت پہ پورا ہی اترتا ہے۔ کہتے ہیں کہ لتا منگیشتر، مکیش، نوتن اور منیش اس گیت کے چار چاند تھے لیکن پانچواں چاند " اندیور " شاید گہرے بادلوں میں چھپا رہا۔ خط لکھنے کے زمانے میں یہ گیت نوجوان اپنی محبوبہ کو خط میں لکھ بھیجتے تھے اور پھر انہیں مثبت جواب بھی ملتا تھا۔ کیونکہ یہ شاعری ہی ایسی تھی جو نوجوانوں کے دلوں اور روح کو چھو لیتی تھی۔ اس گیت کی شاعری اور آواز میں ایسا جادو تھا کہ سننے والے اس کو بار بار سنتے تھے اور کسی کا دل نہ بھرتا تھا۔
انور فرخ آبادی کا کلام عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی نے گایا تو یہ گیت بھی بہت مشہور ہوا۔ اگرچہ یہ گیت کسی فلم میں شامل نہ ہو سکا تھا لیکن آڈیو البم کا حصہ ضرور تھا۔، اس گیت کے بول یہ تھے۔

یہ خط نہیں سدائے دل دردمند ہے
اک بے وطن کا پیار لفافے میں بند ہے
وہ کیا کرے گا، لے کے دو عالم کی راحتیں
جس کو تمہاری یاد میں رونا پسند ہے
ساقی شراب انڈیل کہ چھٹ جائیں ظلمتیں
سورج کی روشنی تری بوتل میں بند ہے
تیرے ہی نقش پا کی بدولت سہی مگر
دنیا کے سامنے تو مرا سر بلند ہے

انورؔ کے پاس دل بھی ہے سجدہ بھی اشک بھی
اے صاحب جمال تجھے کیا پسند ہے) 19(

مندرجہ بالا بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح شعراء اور گلوکار اپنے رومانوی جذبات کا اظہار شاعری یا گلوکاری کی صورت میں سامنے لاتے ہیں اسی طرح اردو گیتوں میں محبوب کے محبت ناموں یا خطوط کا تذکرہ بھی بکثرت موجود ہے اور یہی شاعری دیگر انسانی ضروریات کی طرح خط کی اہمیت کا بھی پتہ دیتی ہے۔

حوالے:

1. https://ur.wikipedia.org/wiki/%D9%85%DA%A9%D8%AA%D9%88%D8%A8_%D9%86%DA%AF%D8%A7%D8%B1%DB%8C
2. Ibid.

3۔ شکیل احمد، اردو میں مکتوب نگاری کی روایت، اردو ریسرچ جرنل شمارہ13، ص ص۔ 160-152

4۔ ڈاکٹر دوست محمد ، خطوط کی خوشبو اور تاریخ، روزنامہ مشرق 29 اپریل 2023، بحوالہ https://mashriqtv.pk/latest/275853/

5۔ ایضاً

6۔ انور خان لودھی، خطوط نویسی: ایک دم توڑتی روایت، بحوالہ https://mag.dunya.com.pk/demo.php/special-report-/4654/2022-10-09

7۔ ایضاً

8۔ ایضاً

9۔ القرآن، سورہ النمل آیت 31

10۔ ایضاً

11۔ تفسیر فہم القرآن میاں محمد جمیل، سورۃ النمل، آیت 22

12۔ تفسیر دعوت قرآن شمس پیرزادہ سورۃ النمل، آیت 22

13. https://www.rekhta.org/ghazals/khat-jo-tere-naam-likhaa-takiye-ke-niiche-rakhtaa-huun-ajmal-siddiqi-ghazals?lang=ur

14۔ حسنین جمال، انڈیپنڈنٹ اردو، 4 اکتوبر 2021 بحوالہ https://www.independenturdu.com/node/80351

15۔ شہناز پروین سحر، پیار کا پہلا خط، بحوالہ https://www.rekhta.org/ghazals/pyaar-kaa-pahlaa-khat-likhne-men-vaqt-to-lagtaa-hai-hastimal-hasti-ghazals?lang=ur

16۔ تنویر گوہر، بحوالہ
https://www.rekhta.org/ghazals/main-ne-jab-jab-bhii-tiraa-naam-likhaa-kaagaz-par-tanweer-gauhar-ghazals?lang=ur
17۔پاکستان فلم میگزین بحوالہ https://pakmag.net/film/details.php?pid=1691
18۔ شہناز پروین سحر، پیار کا پہلا خط، بحوالہ https://www.humsub.com.pk/523855/shehnaz-perveen-sahar-5/
19۔بحوالہ https://sufinama.org/ghazals/anwar-farkhabadi-ghazals?lang=ur